داغ دہلوی اور اقبال شناسوں کا زاویہ نظر

ڈاکٹر طارق ہاشمی

Dr. Tariq Hashmi,

Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Daagh Dehlvi is a very important literary figure of colonial period of sub-continent. He was literary monitor of Allama Iqbal.He was much impressed by him and wrote many ghazals in style of Dagh which are part of his poetic enthologies.

When we go through the literary analysis of his Poetry and narrative about his personality and creative work expressed by enterpreters of Iqbal, we are confronted with the funny expect of his poetic entrepreneurship.If we consider his poetical creations we can find such political, social and psychological problems in form of similes and metaphors that were top reality of his poetical enterprise.

اردو شاعری کے بارے میں دو بیانیوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایک بیانیہ جس کے پیچھے جنابِ حالی کی نظریہ سازی ہے کہ اردو شاعری پست درجے کی نیز قابلِ اصلاح ہے۔ رالف رسل نے اس بیانیے کی روشنی میں ہمارے ذہنی تضاد پر دلچسپ رائے دی ہے کہ ہم ایک طرف میر کا ذکر کرتے ہوئے غزل کو اردو ادب کا سرتاج قرار دیتے ہیں اور حالی کی تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' کے متعلق بات کرتے ہوئے اُسی غزل پر حال کی لگائی ہوئی عہد وکٹوریہ کی تنگ نظرانہ اخلاقی ملامتوں کی تائید کرتے ہیں۔''(۱) س میر کو اور بعض دیگر قدیم شعرا کی عظمت کو ہم پتا نہیں کسی مجبوری کے تحت تسلیم کرتے ہیں لیکن حالی کے اس بیانیے کی طاقت تا حال مسلم ہے۔

مذکورہ بیانیے کو اس وقت مزید توانائی نصیب ہوئی جب بعض ترقی پسندوں نے ماضی کے تمام شعری ورثے کو یکسر مسترد کر دیا۔

اُردو شاعری کے بارے میں دوسرا بیانیہ بعض ماہرین اقبال کا عطا کردہ ہے جو حالی کے توسط

سے تشکیل شدہ بیانیے کو جدید شاعری تک وسعت بخشتا ہے یعنی قدیم شعرا کو گل و بلبل کے قصوں اور عورتوں سے باتوں کے علاوہ کوئی دھیان نہیں تھا اور جدید شعرا تو ہیں ہی گمراہ نیز فنِ شعر میں خام کار۔

مذکورہ دونوں بیانیوں کی روشنی میں شعرا کی اہمیت یا نصابی سطح پر رہ گئی یا گروہ بندی نیز نظریے سے وفاداری بشرطِ استواری کے پیشِ نظر تسلیم کی گئی اور اُن کے علاوہ شعرا کے بارے میں عدم توجہی کو ہم نے اپنے ایمان کا حصہ بنا لیا اگر اُن کے بارے میں کوئی رائے قائم کی بھی تو سرسری مطالعے کی بنیاد پر یا پہلے سے موجود کسی رائے تکرار کی روشنی میں۔

داغ دہلوی کا شمار ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے جنھیں اہمیت دینے کا اردو ناقدین کو کوئی واضح جواز نظر نہیں آتا لیکن چونکہ موصوف اپنی شاعری میں زبان دانی کا دعویٰ بہت کرتے تھے اس لیے اردو تنقید نے اس سلسلے میں انھیں کسی حد تک قابلِ قدر ضرور جانا ہے۔

ماہرینِ اقبال نے داغ کا ذکر جتنے معذرت خواہانہ لہجے میں کیا ہے، وہ شرم ناک ہے۔ اس سلسلے میں ''ابتدائی کلامِ اقبال'' کے مصنف اور اقبال پر داغ کے اثرات کا جائزہ لینے والے جگن ناتھ آزاد ہی کے بیانات کو دیکھ لیجیے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اقبال کو ذہنی بالیدگی حاصل ہو جانے کے بعد اس امر پر ندامت محسوس ہوئی کہ وہ داغ کے اثر میں اب تک کیوں رہے۔ جگن ناتھ آزاد کا بیان ملاحظہ ہوں:

> ''مدت تک داغ کے تربیت یافتہ اقبال کی شاعری داغ کے رنگ میں بھی رہی اور اُس پر اقبال کا اپنا رنگ طبیعت بھی کبھی کبھی شب خون مارتا رہا، جس سے اقبال بے خبر رہے۔''(۲)

جگن ناتھ آزاد نے اپنے مضمون میں آگے چل کر اقبال کو داغ کا استاد ہونے کی رعایت دیتے ہوئے یا یہ خفت مٹانے کے لیے کہ اقبال نے داغ کو استاد بنایا تو ایسا غلط نہیں کیا، داغ کی حمایت میں بھی چند جملے لکھے ہیں اور ان ناقدین سے اختلاف کیا ہے جو داغ کی شاعری کو سوقیانہ، عیاشانہ خیال کرتے ہیں یا اُن کی شاعری کو ہوس ناکی اور رندی کے موضوعات کے تناظر میں دیکھتے ہیں لیکن چند صفحات کے بعد خود ہی اس نظریہ سازی کے اسیر ہو جاتے ہیں جس کو وہ رد کر رہے تھے۔ اُن کے بقول:

> ''داغ کا کمال فنِ اقبال کے نزدیک عشق کا تصور کھینچنا ہے اور یہ رومی والا عشق نہیں یا وہ عشق نہیں جسے بعد میں اقبال کے نظریۂ عشق کی تفسیر بننا تھا بلکہ جنسی عشق ہے اور وہ بھی طوائفوں یا آبرو باختہ عورتوں کے ساتھ والا عشق ہے۔''(۳)

جگن ناتھ آزاد اپنے مضمون کو سمیٹتے ہوئے اپنے اس نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں:

> ''ذکرِ محبوب اور اپنی ذات کا غم جو داغ کے یہاں عیاشانہ یا فاسقانہ یا ہوسنا کی اور رندی کا پہلو لیے ہوئے۔ اقبال کے یہاں آ کے ایک ذہنی کرب کی شدتِ احساس کا حامل ہو گیا ہے اور اس شاعری سے بالکل مختلف ہو گیا ہے جسے کھل

کھیلنے کی شاعری یا نفسانی خواہشات کی شاعری کہا جائے گا اور جس کی مثالیں اقبال کے پہلے دور کی شاعری میں موجود ہیں۔'' (۴)

ان سطور سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ماہرین اقبال، داغ کو کس نگہ سے دیکھتے ہیں اور جب اقبال کے ابتدائی کلام کی بات ہوتی ہے تو وہ اُسے بھی اسی زاویے ہی سے دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی دانشور داغ کے ذکر بغیر ابتدائی کلام اقبال کے بارے میں ایسی کوئی رائے دے کہ اقبال کے ہاں ابتدائی غزلوں میں ہوس ناکی اور رندی کے عناصر ملتے ہیں اور اُن کا کلام سوقیانہ اور عیاشانہ ہے تو یہی ماہرین ان کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جائیں۔

اپنے مضمون میں جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے اپنے استاد کی وفات پر لکھے گئے مرثیے کا بھی تجزیہ پیش کیا ہے اور بعض متروک اشعار کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال، داغ سے چمٹے نہیں رہنا چاہتے تھے اور اپنی شعری فلاح اسی میں خیال کی کہ اپنے استاد کے حلقہ اثر سے باہر آیا جائے۔

''ابتدائی کلامِ اقبال'' کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے داغ کے رنگ کی غزلیں یکسر منسوخ کیں۔ عبوری دور کی غزلوں میں جو متفرق اشعار اس رنگ کے تھے، انہیں بھی خارج کر دیا، جو غزلیں یا بعض غزلوں کے اشعار اس رنگ کے نہیں لیکن شاعرانہ اعتبار سے ساقط المعیار ہیں۔ انھیں بھی خارج کر دیا۔'' (۵)

ابتدائی کلام کو اقبال ہی نے ترک نہیں کیا بلکہ کم و بیش ہر شاعر، اپنے تخلیقی سفر کے آغاز کی نگارشات کو ترک کرتا ہے اور آگے بڑھتا ہے اور یہی کام اقبال نے بھی کیا لیکن اس لیے نہیں کہ اُن کا کلام اپنے استاد کے رنگ میں تھا اور وہ اس سے بیزار تھے جیسا کہ خود ڈاکٹر صاحب نے یہ اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے وہ تمام اشعار جو معیار سے گرے ہوئے تھے انھیں خارج کر دیا۔ گویا ترک کرنے کی وجہ رنگ استاد نہیں بلکہ شعری معیار ہے۔

ایک بھیانک حقیقت جس کی طرف اشارہ کرنا ناگزیر ہے کہ ماہرین اقبال نے اقبال کے ابتدائی کلام کو ترک کرنے کے سلسلے میں جو زمانی نقطہ دیا ہے وہ ۱۹۰۵ء ہے اور یہی داغ کا سالِ وفات ہے۔ اس سے یہ عجیب و غریب تاثر بھی جنم لیتا ہے گویا اقبال کو اپنے استادِ گرامی کے انتقال کا انتظار تھا یا نفسیاتی سطح پر استاد کے انتقال کرتے ہی شاگرد کے باطن میں کمزور سخن یا سوقیانہ کلام کی لو بجھ گئی اور بالیدہ فکری کا عنصر ابھر آیا۔

ماہرین اقبال نے کلامِ داغ میں موجود اُس تہذیبی انحطاط پر گریہ زاری کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی جسے اقبال نے اپنی شاعری کا مستقل بنایا۔ مثلاً داغ کے یہ اشعار دیکھیے اور اقبال کے شکوے کا

مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ شکوہ لکھتے ہوئے وہ اپنے استاد کے رنگِ سخن سے کس حد تک متاثر تھے۔

سوز و گدازِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں
مانندِ آبلہ ہمہ تن آبدیدہ ہوں
بے تابِ درد ہوں تو دلِ رازدار ہوں
لبریز شکوہ ہوں تو زبانِ بریدہ ہوں
صیاد پر ہوں بار تو ہوں باغباں کو خار
آزادِ دام و تابہ چمن نارسیدہ ہوں
اے آرزوئے تازہ نہ کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ
میں پائے شوق و دستِ تمنا بریدہ ہوں
افتادگی پہ بھی نہ گئی اُس کی جستجو
گویا زمیں پہ سایۂ مرغِ پریدہ ہوں(۶)

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ''صقلیہ'' میں جب اقبال تہذیب حجازی کا مزار دیکھ کر گریہ زاری کرتے ہیں تو جہاں بغداد پر نالہ کشی کرنے والے بلبلِ شیراز شیخ سعدی اور دولت غرناطہ کی بربادی پر نوحہ کرنے والے عبدالماجد ابن بدروں (ابن عبدوں؟) کا ذکر کرتے وہاں دلی کی تباہی پر جس واحد شاعر کا بڑی دردمندی اور دل سوزی سے ذکر کرتے ہیں وہ داغ دہلوی ہیں۔ بقول اقبال:

داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر(۷)

جو شاعر ایک عظیم ثقافتی جغرافیے اور اُس سے وابستہ تہذیب کے انحطاط پر خون کے آنسو رویا ہو اُس کی شاعری کو اگر محض رندی اور ہوسنا کی کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایسی دانش مندی اور تنقیدی فہم کا ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رالف رسل، اردو ادب کی جستجو، مترجم: محمد سرور رجا، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص:۵۹
۲۔ جگن ناتھ آزاد، داغ کے اثرات اقبال پر، اقبالیات، لاہور: اقبال اکیڈمی، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۶ء، ص:۶۰
۳۔ ایضاً، ص:۸۸
۴۔ ایضاً، ص:۹۱
۵۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، ابتدائی کلامِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء، ص:۳۲
۶۔ داغ دہلوی، گلزارِ داغ، لکھنؤ: مطبع انوار محمدی، س ن، ص:۱۶۵
۷۔ اقبال، کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، گیارھواں ایڈیشن، ۲۰۱۳ء، ص:۱۶۰

☆.....☆.....☆